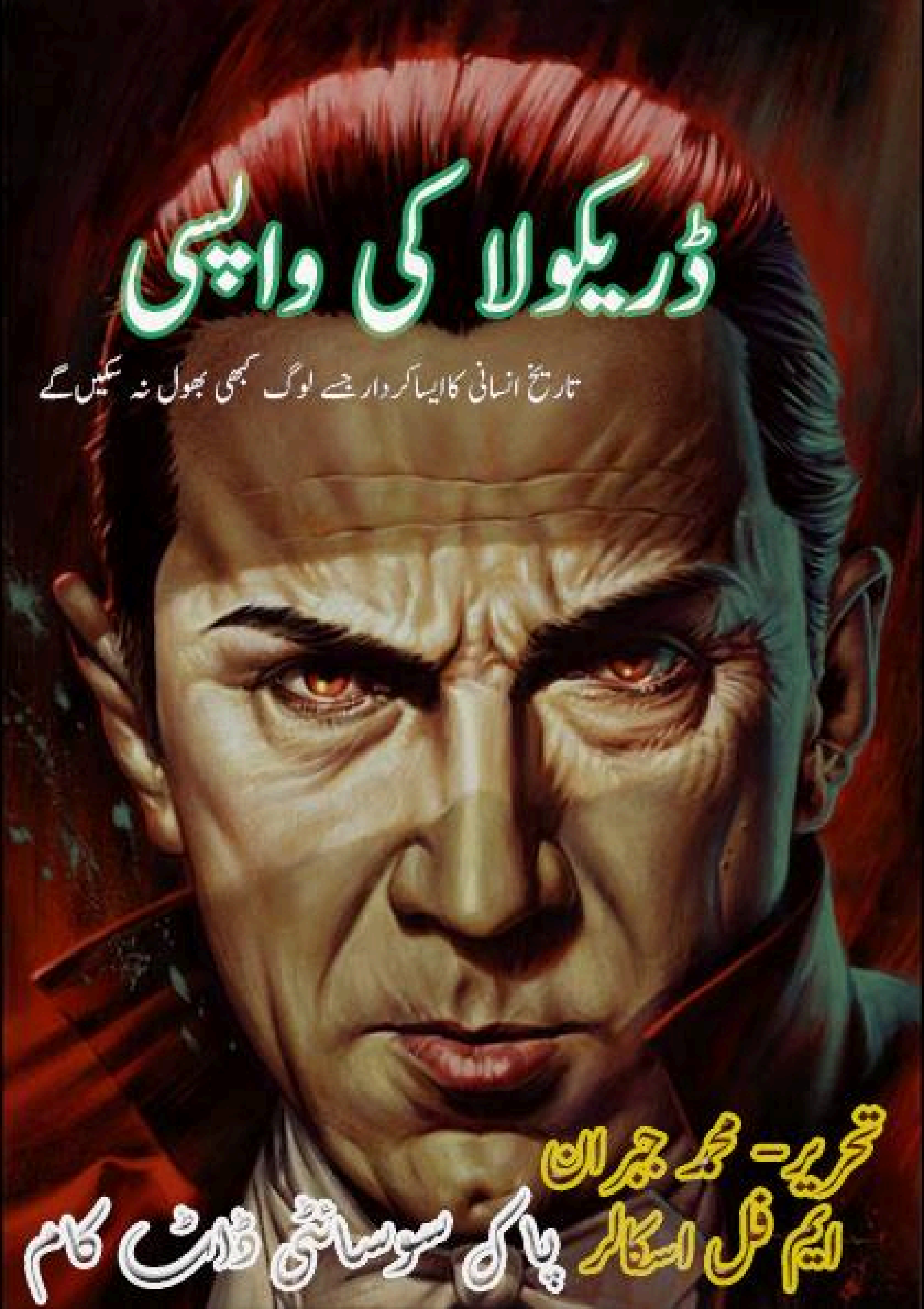
ڈریکولا کی واپسی
تاریخ انسانی کا ایسا کردار جسے لوگ کبھی بھول نہ سکیں گے
تحریر۔ محمد جبران
ایم فل اسکالر
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

ڈریکولا کی واپسی

محمد جبران ایم فِل اسکالر

پاک سوسائٹی

پاک سوسائٹی کے تحت شائع ہونے والے ناول "ناقابل تسخیر" کے حقوق طبع و نقل بحق ویب سائٹ Paksociety.com اور مصنف (محمد جبران) محفوظ ہیں۔

کسی بھی فرد، ادارے، ڈائجسٹ، ویب سائٹ، ایپلیکیشن اور انٹرنیٹ کسی کے لئے بھی اس کے کسی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹیوی چینل پر ڈرامہ و ڈرامائی تشکیل و ناول کی قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر (پاک سوسائٹی) سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی اور بھاری جرمانہ عائد کرنے کا حق رکھتا ہے۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

زندگی کی اہمیت وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس کے اصل مقصد کو پا لیتے ہیں اور جنہیں اس کی اصل حقیقت کا پتہ ہی نہ ہو تو وہ اسے اجاڑ دیتے ہیں۔ بھرپور زندگی گزارنا بھی کسی نعمت سے کم نہیں، دنیا میں کئی لوگ آئے اور چلے گئے۔ مگر اس فلسفے کو گہرائی میں اتر کر بس چنیدہ لوگ ہی سمجھ پاتے ہیں۔ ہندو دھرم میں آواگون یعنی نظریہ تناسخ کا وجود ہے جسے سات جنموں کا تصور بھی کہتے ہیں ۔وہ محض دیومالائی نہیں بلکہ اس میں کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ جس میں روح آدمی کے مرنے کے بعد ایک قالب سے دوسرے قالب میں سفر کرتی ہے، یہاں تک کے سات جنموں کا ایک سائیکل پورا ہوتا ہے۔ میں اس نظریئے کا قائل تو نہیں مگر خود کو اس کے قریب پاتا ہوں۔ موت کی اصل حقیقت کیا ہے؟ شاید آپ انسانوں میں سب سے زیادہ میں ہی جانتا ہوں کیونکہ موت کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اب تو خود کو انسان کہتے ہوئے بھی کوفت سی ہوتی ہے۔ انسان خود غرض ہے، لالچی ہے ،اپنے مفاد کا غلام ہے، کس کو قتل کرنا اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور ان سب سے بڑھ کر وہ اندر سے منافق اور درندہ صفت ہے سو خود کو انسان کہلوانا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔۔ کہنے کو بہت کچھ ہے، جذبات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر اپنے قلب میں مچل رہا ہے مگر میں اپنی کہانی کا آغاز اپنے مرنے کے بعد کی زندگی کے آخری باب سے کروں گا۔ شاید آپکو عجیب لگے مگر میری الجھی ہوئی زندگی کے چند پہلو ہی بیان کر پاؤں گا۔ آپ لوگ انہی کو سمجھ لیں یہی بہت ہیں۔۔۔۔ کیونکہ اس سے زیادہ آپ کی برداشت سے باہر ہو جائے گا۔

میں اس وقت کراچی ایرپورٹ کی وسیع و عریض بلڈنگ کے تھرڈ فلور پر موجود اسموکنگ روم میں بیٹھا گہرے کش لے رہا تھا۔ میرے چہرے پر سیاہ چشمہ گلے میں سرخ مفلر اور بدن پر سفید شلوار قمیض تھی۔ جبکہ میری گول میز کی سائیڈ پر ایک بریف کیس بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ کمرہ سگریٹ پینے والے افراد کے لئے خصوصی طور پر بنایا گیا تھا۔ درمیانے سائز کے اس روم میں کم و بیش دس

کے قریب چھوٹی میزیں اور انکے ساتھ دو دو کرسیاں ایک خاص ترتیب سے رکھی ہوئیں تھیں۔ اس وقت اس روم میں سوائے میرے اور کوئی نہیں تھا اور میں اپنے ایک خاص مہمان کا انتظار کر رہا تھا۔ میری نظر سامنے لگی ہوئی وال کلاک پر تھی جو اس وقت دوپہر کے پونے تین کا وقت بتا رہی تھی۔ سیکنڈ کی سرخ سوئی بظاہر تو دھیمی آواز سے چل رہی تھی مگر ہر گزرتے لمحے میرے سر پر پوری شدت کے ساتھ آ کر لگتی تھی۔ انتظار چاہے لمحوں کا ہو یا پھر گھنٹوں کا معلوم ایسا ہی ہوتا ہے جیسے صدیوں پر محیط ہو۔ اس کا دامن ندی سے شروع ہو کر سمندر جتنا وسیع اور لامتناہی ہوتا ہے۔ یہ اپنی جبلت میں نہایت بے وفا، بے رحم اور سفاک ہوتا ہے۔ بے صبر انسان اس کے پیروں میں گر کر روتا ہے، گڑگڑاتا ہے رحم کی بھیک مانگتا ہے، مگر یہ ظالم شیر کی طرح اپنے پنجے اور دانت جب ایک بار اس کے وجود میں گھاڑ دے تو پھر اس کے وجود سے پورا خون نچوڑے بغیر جان نہیں چھوڑتا۔

میری فلائٹ آج سہ پہر ساڑھے تین کی تھی جس میں ابھی پینتالیس منٹ باقی تھے۔ مگر میں اپنے جس مہمان کا انتظار کر رہا تھا اسکا فل الحال کہیں اتہ پتہ نہیں تھا۔ یہ میرے اِس جنم کی آخری فلائٹ تھی اور مجھے اپنے سمیت فلائٹ اے۔ کے دو سو پندرہ کے دیگر مسافروں کا انجام بھی معلوم تھا۔ میرے دائیں جانب کمرے کی دیوار کے عین وسط میں ڈراک گلاس کی ایک کھڑکی لگی ہوئی تھی جس کے دوسری طرف ایک

بہت بڑا اور جدید ترین آسائشوں سے مزین ہال تھا۔ آج خلافِ توقع رش ذرا کم تھا اس لئے اسموکر زروم بھی خالی تھا۔ مجھے دھیرے دھیرے کوفت ہونے لگی وقت گزرتا جا رہا تھا اور میرا مہمان میری توقع کے بر خلاف دیر کرتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے انجام کی تو پوری خبر تھی مگر میں اپنے مرنے کے بعد لوگوں کے لئے کچھ چھوڑ کر جانا تھا۔

میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح آخری کش لیا اور دھواں چھوڑتے ہوئے تھکے ہوئے انداز میں سامنے پڑی ہوئی ایش ٹرے پر اپنی سگریٹ کو مسل کر بجھا دیا۔ میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ انتظار کر سکتا تھا اس سے زیادہ نہیں۔ میں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور وقت گزاری کے لئے اسکی ٹچ اسکرین سے کھیلنا شروع کر دیا۔ میری آخری کال اردو کے سب سے بڑے میگزین "انقلابِ اردو میگزین" کے بانی و مدیر اعلیٰ شفقت عزیز صاحب کو تھی۔ وہ عرصہ دراز سے اردو کے قارئین کی اس میگزین کے ذریعے خدمت کر رہے تھے۔ جب میں نے انہیں کال کی تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا لیکن پھر آنے کا وعدہ کر کے تا حال پراسرار طور پر غائب تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میری کال کو سنجیدہ ہی نہ لے رہے ہوں۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ ایسے

میں ایک دراز قد، گھٹی ہوئی چھاتی اور پختہ عمر کا آدمی اسموکر روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میں نے گردن گھما کر امید افزا نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے اور پھر میں نے اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے انکا استقبال کیا۔

"آیئے آیئے شفقت صاحب۔۔۔ میں پروفیسر کارٹر۔۔۔ میں نے ہی آپکو یہاں آنے کی تکلیف دی تھی۔ اس کے لئے میں دلی طور پر معذرت خواہ ہوں اور آپکا مشکور بھی کے آپ نے میرے لئے اپنا قیمتی وقت نکالا۔" میں نے آگے بڑھ کر ان سے مصافہ کیا اور پھر انہیں اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھا دیا۔ انہوں نے اپنے سر کو ہلکی سے جنبش دی اور مشکوک نظر سے مجھے گھورنے لگے۔

"جی میں آپکے اضطراب سے باخوبی واقف ہوں۔۔۔ بس مجھے تھوڑا سا وقت دیں میں آپکی پریشانی ابھی دور کر دیتا ہوں۔" میں نے انکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر نیچے جھک کر ایک ہاتھ سے بریف کیس اٹھایا اور دوسرے سے ایش ٹرے سائیڈ پر کر کے اسے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ زندہ لاش ہیں۔۔۔۔" انہوں نے گھورتے ہوئے اپنا نچلا ہونٹ چبا کر کہا۔ "اگر یہ مذاق ہوا تو جان لیجئے نہایت بھونڈا ہو گا اور آپ کو اس کی سخت قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ آپ ابھی میرے تعلقات نہیں جانتے، میں پولیس کو بلالوں گا اور اور آپ تمام عمر جیل میں سڑتے رہیں گے۔"

میں نے ان کی بات تحمل سے سنی اور بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کے بعد میں نے بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک سبز رنگ کی ڈائری نکالی۔ اس پر باقاعدہ تازہ خون سے۔"ڈریکولا" لکھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی شفقت صاحب کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ میں نے ڈائری کھولی اور اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ باہر نکال لیا۔ جس پر ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک تحریر تھی۔ یہ دونوں چیزیں انکے حوالے کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"مجھے بس یہی چیزیں آپکو دینی تھیں۔ یہ میری اور آپکی پہلی۔۔۔۔ اور آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد آپ میری گرد کو بھی نہیں پاسکیں گے۔ میں محض آپکی زندگی میں ایک خواب کی حیثیت رکھتا ہوں، ایک ایسا خواب جسکی تعبیر آپ چاہ کر بھی نہیں پاسکتے۔ میں ہوا کا وہ جھونکا ہوں جو انسان کو چھو کر گزر جاتا ہے اور اسے اس کی لذت کا احساس بعد میں ہوتا ہے۔ بس میری اک یہی ادنیٰ

http://paksociety.com

سی خواہش ہوگی کہ آپ میری اس ڈائری کی چیدہ چیدہ باتیں اپنے میگزین میں شائع کر دیں۔ میری بھٹکتی روح آپکی ممنون رہے گی۔ شکریہ"

یہ کہہ کر میں نے بریف کیس بند کیا اور اپنے چشمے کو ہلکا سا نیچے کیا تو میری آنکھوں کو دیکھ کر ان کا چہرہ فق ہوگیا۔ ہونٹ کھل کر کانپنے لگے اور میں ان سے بے نیاز بغیر سلام کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔۔۔۔۔ اب یقیناً سیکنڈ کی سوئیاں ان کے سر پر ہتھوڑے برسا رہی ہونگی۔

☆☆☆☆

قارئینِ کرام درج بالا تحریر یقیناً ڈریکولا کے ہی قلم سے نکلی ہوئی ہے۔ اس کی اور میری ملاقات آج سے چند ماہ قبل ہوئی تھی۔ وہ یقیناً ایک ہوا کا جھونکا تھا جو مجھے چھو کر گزر گیا اور ایسا گزرا کہ تاحال اس کا کہیں کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ مجھے واقعی توقع نہیں تھی کہ میری زندگی میں کبھی ایسا ہوگا۔ انسان کو واقعی کبھی کبھی ایسے ہی پراسرار واقعات سے پالا پڑتا ہے اور وہ تجربات بعض اوقات لفظوں میں ڈھالنا مشکل ہو جاتے ہیں۔ پراسرار یا ماورائے عقل واقعات ایسی مالا کا نام ہیں جسکی ہر ڈور ایک دوسرے میں کچھ ایسے الجھی ہوتی ہے کہ اگر اسے سلجھانے جاؤ تو آدمی مزید الجھ کر رہ جاتا ہے۔

ڈریکولا کے جانے کے بعد کئی سوالات نے جنم لے لیا ہے جن کے جوابات ملنا تقریباً ناممکن معلوم ہیں۔ وہ فلائٹ اے۔ کے دو سو پندرہ روانگی کے تیس منٹ بعد ہی حیرت انگیز طور پر بحیرہ عرب میں جاگری تھی۔ یہ بات قانون نافذ کرنے والے اداروں سے لیکر ایئرپورٹ کے اپنے افسروں تک کے لئے ناقابلِ یقین تھی کہ آخر اس روز فلائٹ کو کیا ہوا تھا؟ اور لاہور جانے والی فلائٹ ایکدم سے اپنی سمت تبدیل کر کے ایک سو اسی کے زاویے پر بحیرہ عرب میں کیسے جاگری تھی؟ بس یہی نہیں فلائٹ پر موجود تمام افراد کی لاشیں صحیح سلامت سمندر سے واپس نکال لی گئی تھیں سوائے ایک کے۔۔۔۔۔ جی ہاں سوائے ایک پروفیسر کارٹر کے ان کی لاش نہیں ملی۔ کئی ماہ تک ان کی لاش کو سمندر کی گہرائیوں میں تلاش کیا جاتا رہا مگر نتیجہ صفر۔ اس کے علاوہ ائیرپورٹ انتظامیہ کے ریکارڈ ز کی جب چھان بین کی گئی تو پروفیسر کارٹر نام اور ان کی روانگی کا ٹائم تو لکھا ہوا تھا مگر انکے ایڈریس کا خانہ حیرت انگیز طور پر خالی تھا۔

انہی غیر معمولی حالات کو دیکھ کر میری تجسس کی رگ پھڑکنے لگی۔ اس روز جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو آخر میں جب انہوں نے اپنا چشمہ ہلکا سا نیچے کیا تو مجھے انکی آنکھوں میں پانی کے قطروں کے بجائے خون کے قطرے نظر آئے۔ میں نے آج تک کسی

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

انسان کی آنکھوں سے خون نکلتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ اسی چیز کو دیکھ کر میں اس معمے کو دلچسپی سے اب تک نہ صرف دیکھ رہا تھا بلکہ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو آئندہ بھی اپنی تحقیق جاری رکھوں گا۔ اس دوران میں نے اپنے نمائندوں کو تحقیق پر لگایا ہوا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ پروفیسر کارٹر ڈیفنس میں رہتے تھے اور پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے مگر وہ پریکٹس کے بجائے پڑھانے کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی خدمات کراچی کے ایک سب سے بڑے پرائیویٹ مدرسے کو دے رکھی تھیں۔ پارٹ ٹائم میں وہ اپنی کوٹھی کے زیر زمین موجود ایک بڑی سی لیبارٹری میں انسانی خون پر تحقیق کر رہے تھے۔ انکی آخری ریسرچ اس پر تھی کہ انسانی خون میں موجود وائٹ بلڈ سیلز کی تعداد میں اضافہ کر کے ان میں قوت مدافعت کس طرح بڑھائی جا سکتی ہے۔ اسکے علاوہ بڑھی ہوئی قوت مدافعت والے انسانی خون پینے سے انسانی دماغ کو بے پناہ قوت مل سکتی ہے جس سے انسان اب تک کی کی ہوئی حیرت انگیز سائنسی تحقیقات کو مات دے کر اس سے زیادہ پراسرار اور عجیب و غریب قسم کی ایجادات کر سکتا ہے۔ انکی پرسنل ڈائری کے مطابق اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اس کا ایک اور فائدہ یہ ہوتا کہ انسان کی اوسط عمر ساٹھ سے بڑھ کر ایک سو ساٹھ تک ہو سکتی تھی۔ اس تحقیق پر انہیں کس حد تک کامیابی ہوئی، انکی ڈائری اس حوالے سے مکمل خاموش تھی۔ شاید یہ راز بھی انکے ساتھ ہی کہیں سمندر میں غرق ہو گیا۔

اس کے علاوہ ان کی ڈائری سے انکے گزشتہ جنم کے حوالے سے جو معلومات ملی تھیں وہ کچھ اس طرح سے تھیں کہ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کی پہلی اینٹ انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر رکھی تھی۔ جسے پہلی سپاہیوں کی بغاوت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، ان کے بقول وہی ان کی اصل زندگی تھی جب انہوں نے منگل پانڈے کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس دور میں وہ ایک ہندو تھے اور انکا نام چندر بہادر گپت تھا۔ ان کے اسی جرم کی پاداش میں انگریز نے انہیں سولی پر لٹکا دیا تھا اور انکے بقول یہ ایسا کام تھا جس پر وہ اس جنم میں بھی فخر محسوس کرتے تھے۔ انہیں موت سے ڈر نہیں لگتا تھا مگر انگریزوں کی غلامی برداشت سے باہر تھی۔ اس موت کے بعد انہیں یہ نیا روپ کیسے ملا اور وہ پروفیسر کارٹر کیسے بنے؟ ان سوالات کے جوابات بھی تاحال ایک راز ہیں۔ وہ اپنی ڈائری میں اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ وہ اپنے کئی شاگردوں کا خون پی چکے تھے اور بہت سوں کا خون انکی لیبارٹری میں اب بھی تحقیق کے لئے موجود تھا۔ ان کا لاہور جانے کا کوئی مقصد نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنے اس جنم سے نجات پانا چاہتے تھے۔ انہیں انسانوں کے دہرے معیارات سے تو شدید چڑ تھی مگر انسانیت کی خدمت کے لئے وہ لگے رہے

http://paksociety.com

۔مجھے نہیں معلوم کے کبھی زندگی میں پھر سے ان سے کسی روپ میں ملاقات ہوگی یا نہیں مگر میرا من ضرور ہے کہ اب کی بار اگر انکی واپسی ہوئی تو اپنے سخت رویے کی معافی ضرور مانگوں گا۔۔ قارئین کو بتانے کے لئے میرے پاس ان کے راز اب بھی سینے میں موجود ہیں مگر ڈریکولا کے خوف سے میں انہیں اپنی زبان پر یا قلم کے ذریعے صفحے پر نہیں اتار سکوں گا۔ڈائری کے آخری صفحے پر مجھے میری موت کس طرح ہوگی؟ اس کی نوید پہلے ہی سنائی جا چکی ہے۔ جس نے مجھے جیتے جی مار دیا ہے شاید یہ تحریر میری آخری تحریر ہو۔۔۔کیونکہ بقول ڈریکولا کے جب وہ آخری بات بول دیتا ہے تو وہ آخری بات سچ ہو جاتی ہے۔ پتہ نہیں اسے یہ سب باتیں کیسے پتہ چلتی ہیں۔۔۔۔۔یہ اس کہانی کی آخری سطریں ہیں اور میری آنکھیں نامعلوم کیوں بھیگ رہی ہیں۔ ہاتھوں میں یکلخت ریشہ اتر آیا ہے اور سانسیں اکڑ رہی ہیں۔ بدن میں کپکپی طاری ہے۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔!!

نوٹ: قارئین کرام اس تحریر کے لکھنے کے دوران ہی انقلاب اردو میگزین کے مدیر اعلیٰ انتہائی پر اسرار انداز میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے

اس کے بعد حیرت انگیز طور پر ڈریکولا کی ڈائری کو نامعلوم کیسے آگ لگ گئی اور وہ جل کر کوئلہ ہوگئی۔ آپ سب سے شفقت عزیز صاحب کی بخشش کے لئے دعا کی جاتی ہے۔ اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور متاثرین کو صبر جمیل عطا کرے۔ اب سے اس ادارے کے مدیر اعلیٰ انکے شاگرد علی کریم صاحب ہونگے۔ شکریہ۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆

ختم شُد

آپکی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔۔

http://paksociety.com